Al-Kashaf: Research Journal for Social Sciences (Miscellaneous)
Volume: 03, No: 01. January – June 2023
ISSN: 2790 – 8798; E-ISSN: 2790 – 8801

مشترکہ احساسات، مختلف ادوار: میر تقی میر اور ناصر کاظمی کی شاعری کا اندازِ بیان

Shared Feelings, Different Periods: Narrating the Poetry of Mir Taqi Mir and Nasir Kazmi

Dr. Hakan Kuyumcu*

* Associate Professor, Department of Urdu Language and Literature, Selcuk University, Konya, Turkey.

KEYWORDS

Mir Taqi Mir
Nasir Kazmi
Urdu Poetry
Romanticism
Literary Analysis

ABSTRACT

This article presents a comparative analysis of the poetic oeuvre of Mir Taqi Mir and Nasir Kazmi, two stalwarts of Urdu literature. It explores how both poets, despite belonging to different eras, exhibit a profound sense of romanticism in their works, drawing inspiration from personal experiences and the socio-cultural milieu of their times. Mir, hailed as one of the pioneers of Urdu poetry, manifests a classical style characterized by eloquence and emotional depth, while Kazmi's poetry reflects a modern sensibility infused with romantic fervor and existential contemplation. The article delves into their thematic preoccupations, including love, longing, melancholy, and the search for meaning, contextualizing these themes within the broader landscape of Urdu literary tradition. Through a nuanced examination of selected verses and critical insights, it elucidates the enduring relevance and universal appeal of Mir and Kazmi's poetry, offering readers a deeper understanding of their artistic legacies and the timeless essence of Urdu poetic expression.

تعارف

مصنف مقالہ ہذا کی عمرزار اردو زبان وادب پڑھنے اور پڑھانے میں صرف ہوئی ہے۔ لڑکپن اور اوئل جوانی کی عمر اردو زبان پڑھنے میں اور پھر بھری جوانی اور اب ڈھلتی عمر اردو پڑھانے میں گزر رہی ہے۔ گزشتہ بیس برس سے قونیہ کی سلجوق یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ترک طلبہ کو اردو زبان پڑھا رہا ہوں۔ نہ صرف ہماری یونیورسٹی بلکہ ترکی میں اردو زبان کی تعلیم دینے والی دیگر انقرہ اور استنبول یونیورسٹیز میں بھی شعبہ ہائے اردو کا نصاب شاعری میں میر، غالب، انیس اور اقبال تک بمشکل ہی پہنچ پاتا ہے جبکہ نثر میں سر سید کے زمانے تک اور بس۔۔۔ اس لیے ترکی میں رہ کر اردو تعلیم حاصل کرنے والے اکثر طلبہ کی آخری صدی میں اردو کے بڑے شعراء سے واقفیت قدرے کم ہوتی ہے۔ اگرچہ موجودہ دور میں سوشل میڈیا کی وجہ سے کسی حد تک طلبہ بعض اردو کے مشہور شعراء کے نام سے واقف ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ واقفیت محض سوشل میڈیا کی ہی حد تک ہوتی ہے یا پھر چند شعروں تک۔ میرا ذاتی طور پر میر سے تعارف تو ترکی میں ہی دوران تعلیم ہو گیا تھا جبکہ ناصر کاظمی سے میرا پہلا تعارف پی-ایچ-ڈی کے تحقیقی مقالہ کی تحریر کے سلسلہ میں پاکستان میں قیام کے دوران زکریا یونیورسٹی، ملتان کے ایک نوجوان استاذ ڈاکٹر قاضی عابد صاحب کے توسط سے ہوا تھا کہ جنھوں نے ایک بار اردو کے چند جدید شعراء سے میرا تعارف کروایا تھا۔ یہ مقالہ تحریر کرتے ہوئے قاضی ڈاکٹر عابد کے نام کے ساتھ مجھے بوجھل اور افسردہ دل کے ساتھ مرحوم لکھنا پڑھ رہا ہے۔ دیرینہ ساتھی جو کہ وقت سے بہت پہلے اپنے دوستوں سے جدا ہو کر خدائے لم یزل کے حضور حاضر ہو گئے ان کے لیے یہی کہوں گا کہ

اے فرشتہ اجل کیا خوب تھی تیری پسند
پھول وہ چنا جو سارے گلشن کو ویران کر گیا

Correspondence Author: Dr. Hakan Kuyumcu
Email Address: hkuyumcu@selcuk.edu.tr

ڈاکٹر قاضی عابد صاحب نے اردو کے جن شعراء سے میرا تعارف کروایا تھا ان میں ناصر کاظمی کو باقی شعراء کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ چنانچہ میں نے بھی اپنے فطری تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر پاکستان سے ترکی واپس آتے ہوئے ناصر کاظمی کی "کلیات" اور چند گلوکاروں کی جانب سے ناصر کاظمی کی گائی ہوئی غزلیں بھی ساتھ لیتا آیا۔ ناصر کاظمی کی کلیات کے مطالعہ کے دوران میں نے محسوس کیا کہ ناصر کاظمی کثیر الجہتی شاعر ہیں بالخصوص ان کی غزلوں میں تو میر تقی میر کی سی غزلوں کا ذائقہ اور چاشنی موجود ہے۔ اردو افق کے ان دو مہتاب شعراء کی شاعری میں مماثلات کو زینت قرطاس کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں شاعروں کی زندگی پر ایک مختصر طائرانہ نظر ڈال لی جائے۔

مختصر حالاتِ زندگی

میر تقی میر 1722ء کے لگ بھگ اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے آباؤاجداد حجاز مقدس سے دکن اور پھر احمد آباد (گجرات) پہنچے تھے جبکہ ان کے جدکلاں نے اکبر آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ میر تقی کی عمر ابھی محض گیارہ برس ہی کی تھی کہ ان کے صوفی منشاء والد میر محمد علی متقی وفات پا گئے۔ ان کے مشفق اور درویش چچا بھی رحلت کر چکے تھے۔ سوتیلے بھائی محمد حسن نے بھی میر سے بے اعتنائی کا رویہ روا رکھا۔ بچپن کے ان واقعات نے میر کے ذہن پر ان مٹ اثرات چھوڑے جو عمر بھر ان کے ساتھ رہے اور ان کا اثر میر کی شاعری پر بھی ہوا۔ محض گیارہ برس کی عمر میں میر بڑی کسمپرسی کی حالت میں معاش کی تلاش میں دلی آ گئے (عبداللہ، ج21/927)۔ والد اور مشفق چچا کا انتقال، سوتیلے بھائی کی بدسلوکی، محبت میں ناکامی، دہلی کی جانب نقل مکانی، ماموں کی بے التفاتی، دہلی سے لکھنو کی جانب ہجرت، معاش کی تلاش میں دربدر کی ٹھوکریں، اپنے سامنے دلی کی بربادی کو دیکھنا، نادرہ شاہ کے قتل عام، احمد شاہ ابدالی کے حملوں کے علاوہ مغلیہ سلاطین دھلی کی خانہ جنگی اور بھائیوں کو قتل کرنا وغیرہ جیسے الم بھرے واقعات کی وجہ سے ان کی شاعری ذاتی دکھوں سے بڑھ کر ہمہ گیر انسانی دکھ درد کی کہانی بن گئی۔ اشرف المخلوقات کی اقدار کی زلالت اور زوال کو دیکھ کر میر ایک افسردہ، غم زدہ، الم پسند اور دروں بین انسان بن گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں سوز و گداز اور شدتِ جذبات کی حدت بدرجہ اتم موجود ہے۔ البتہ یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ یہ سوز و درد ان کی زندگی کے ذاتی تجربات کی پیداوار تھا اس لئے اس میں جلانے کی نہیں بلکہ مرہم کی صلاحیت موجود تھی۔ ڈاکٹر اے بی اشرف لکھتے ہیں۔

"۔۔۔ان کی (میر کی) شاعری ان کے خلوص کی پیداوار ہے۔ یہ اس درد و غم سے عبارت ہے جو میر کی زندگی کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ اس لئے کہ اس درد و غم نے ان کے کلام میں وہ تاثیر بھر دی جس نے ہر زخمی دل کو مرہم فراہم کیا۔" (اشرف: 47)

دسمبر 1925ء میں انبالہ میں پیدا ہونے والے ناصر کاظمی کے والد سید محمد سلطان کاظمی رائل انڈین آرمی میں صوبیدار میجر کے عہدہ تک پہنچے جبکہ والدہ انبالہ کے مشن گرلز اسکول میں ٹیچر تھیں۔ ناصر نے اپنی والدہ کی ہی زیر نگرانی گلستان، بوستان، شاہنامہ فردوسی، فسانہ آزاد، الف لیلی، صرف و نحو اور اردو شاعری کی کتابیں پڑھیں۔ والد کے پیشہ ورانہ تبادلوں کی وجہ سے ان کا بچپن انبالہ، نوشہرہ، پشاور اور لاہور سمیت کئی مختلف شہروں میں گزرا تھا۔ جلد ہی انھیں یکے بعد دیگرے والدین کے چل بسنے کا غم بھی جھیلنا پڑا۔ تقسیم ہند کے موقع پر وہ انبالہ سے انتہائی کسمپرسی کی حالت میں لاہور آ گئے اور عمر بھر اسی تاریخی شہر کو اپنا مسکن بنایا۔ میر کا عہد وہ وقت تھا جب کئی صدیوں سے ہندوستان پر حکمران رہنے والے مسلم اتراک اپنے زوال کی جانب تیزی سے گامزن تھے۔ شمال کی جانب سے آنے والے حملہ آوروں کے بعد سات سمندر پار سے آئی ہوئی گوری اقوام بھی اس سونے کی چڑیا

ہندوستان کو اپنے پنجرے میں قید کرنے کے لیے جال بچھا رہی تھیں۔ جبکہ ناصر کاظمی کی زندگی کا ابتدائی عہد وہ تھا جس میں سارے ہندوستان میں اس یورپی قوم کی طاقت اور اقتدار کا طوطی بولتا تھا۔ یورپی اقوام کی آپسی لڑائیوں اور بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر جب انگریزوں کے لیے ہندوستان کو مزید غلام بنائے رکھنا ممکن نہ رہا تو انہوں نے جاتے جاتے نہ صرف ہندوستان کی مقدس گائے کے ٹکڑے کر دیے بلکہ مذہب کے نام پر مقامی باسیوں میں نفرت و دشمنی کی بھی دیواریں کھڑی کر کے گئے۔ ناصر کاظمی نے بھی اپنی شاعری میں بھی تقسیم ہند، ہجرت کا دکھ، بٹوارہ و ہجرت کی تکالیف اور اثرات کو خصوصی طور پر موضوع سخن بنایا ہے۔ اگرچہ تقسیم ہند کے بعد وہ مسلم اکثریتی ملک پاکستان آ تو گئے لیکن ناصر بھی میر کی طرح عمر بھر انبالہ کی یادوں کو اپنے ذہن سے نہیں نکال سکے۔ چنانچہ ناصر کاظمی "نشاطِ خواب" میں کہتے ہیں:

انبالہ ایک شہر تھا، سنتے ہیں اب بھی ہے
میں ہوں اُسی لٹے ہوئے قریے کی روشنی
اے ساکنانِ خطہِ لاہور! دیکھنا
لایا ہوں اُس خرابے سے میں لعلِ معدنی
جلتا ہوں داغِ بے وطنی سے مگر کبھی
روشن کرے گی نام مرا سوختہ تنی (رضوی:35)

اب ذرا میر کے یہ مشہور اشعار کو بھی سامنے رکھیے جو انہوں نے دلی کے لٹ جانے کے بعد مجبوراً اس شہر سے چلے جانے کے بعد کہے تھے:

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے (آزاد:173)

یوں کہا جا سکتا ہے کہ اردو کے ان دونوں بڑے شاعروں کے یہاں کرب کی کیفیت کا ایک بنیادی سبب ہجرت بھی ہے۔ میر کو اپنا رول ماڈل سمجھنے والے ناصر کاظمی بھی میر ہی کی مثل دروں بین اور اداس طبعیت کے مالک تھے۔ چنانچہ مرحوم ڈاکٹر حسن رضوی لکھتے ہیں:

"اداسی ناصر کو بچپن ہی سے دامن گیر تھی۔ رومانوی طبعیت کے سبب بہت جلد اداس ہو جاتے تھے۔ اس اداسی کا مداوا وہ شاعری کے توسط سے کرتے یا پھر موسیقی سے دل بہلاتے"۔

گویا میر کی اداسی ناصر کے مزاج میں عود کر آئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں بھی وہ میر کی شاعری ساد کھ، رنج اور المیہ کی فضا غالب نظر آتی ہے۔

مماثلات

(الف) زمانہ حیات

اکبری عہد کے زمانہ عروج میں (1575-1605ء) میں ہندوستان میں کئی طرح کی ابحاث کا زور ہوا ان میں سے ایک مشہور بحث عقیدہ تناسخ کی بحث تھی۔ حتیٰ کہ ملا عبدالقادر بدایونی کے بقول تو بادشاہ بھی اس عقیدہ کا قائل ہو گیا تھا (بدایونی،: 467-468)۔ تناسخ کہ جس کو آسان الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ روح فنا نہیں ہوتی بلکہ ایک جسم سے نکل کر کسی دوسرے جسم میں منتقل ہو جاتی ہے۔ تناسخ یعنی ایک ہی ذات کا مختلف حالتوں اور جلوئوں میں ظہور کرنا۔ "ویدانت میں "خواہش تناسخ کا باعث ہے۔ ذات اپنے کمال پر پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے لیکن خواہشوں کی تکمیل نہیں ہوتی۔ ان کی تکمیل کے لیے ذات دوسرے روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ یہ عقیدہ درست ہے یا غلط اس سب سے قطع نظر ہندوستانی مصنفین اکثر و بیشتر جب کسی شعبہ کے دو بڑے آدمیوں کا تقابل کرنا چاہ رہے ہوں تو ایسے الفاظ و تشبیہات وغیرہ کو بھی استعمال کر لیتے ہیں۔ چنانچہ سر عبدالقادر نے "بانگ درا" کے دیباچے میں اقبال و غالب کی شاعری کو خراج تحسین پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ایک تقابل کرتے ہوئے لکھا کہ

"اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسد اللہ خان غالب کو اردو اور فارسی کی شاعری سے جو عشق تھا اس نے ان کی روح کو عدم میں جا کر بھی چین نہ لینے دیا اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسدِ خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے اور اس نے پنجاب کے ایک گوشے میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں، دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا"(عبدالقادر: 35)۔

غالب و اقبال پر شیخ عبدالقادر کا یہ تبصرہ تقی میر اور ناصر کاظمی پر بھی بالکل صادق آتا ہے۔ ناصر کاظمی کو بیسوی صدی کا میر تقی میر بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ تقی میر کا سن وفات تو 1810ء ہے لیکن انہیں اٹھارویں صدی کا ہی شاعر کہا جاتا ہے کیونکہ انیسویں صدی میں اردو شاعری کا سرتاج غالب جبکہ بیسوی صدی میں اردو زبان کا شاعر اقبال ہے۔ تو گویا میر تقی اٹھارویں صدی میں اردو کے افق سے غروب ہوئے اور بیسوی صدی میں ناصر کاظمی کی صورت میں دوبارہ سے ابھرے۔

(ب) درد و الم:

ناصر کاظمی کی غزلوں میں بھی اداسی، مایوسی، جمالیاتی طرز احساس، سوز و گداز اور پھر حیات افروز رجائیت کی چادر، فطرت سے محبت، درد اور صدمہ جات۔۔۔ سب احساسات، جذبات میر ہی کی مثل تو ہیں۔ اگرچہ دونوں کا سماجی عہد قدرے مختلف تھا کہ میر کا دور، دورِ قدیم تھا جبکہ ناصر کاظمی کا زمانہ، زمانہ جدید ہے۔۔۔ اور پھر فسادات، قتل و غارت، ہجرت، اشرف المخلوقات کی تذلیل۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا۔۔۔ انہی حالات نے ناصر کو مدد دی کہ وہ کم سے کم الفاظ اور بحروں میں ان حالات کی عکاسی کر سکیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر کا کہنا بجا ہے کہ:

" چھوٹی بحروں میں میر کی مانند کم سے کم اور سادہ سے الفاظ میں جذباتی کیفیات کی عکاسی ناصر کے فن کی اہم ترین خصوصیت ہے۔" (اختر: 556)

(ج) تنہائی:

رات جو کہ تنہائی، اداسی اور تاریکی کی علامت ہے۔ میر اور ناصر دونوں کی شاعری میں اس کا حوالہ بہت ہی تواتر کے ساتھ ملتا ہے۔ شاید زمانہ بھر کے دکھوں کے مارے ہوئے یہ دونوں شعراء اپنے غموں کو کم کرنے کے لیے تنہائی میں بیٹھ کر آنسو بہاتے، تاریکی میں جاگتے اور اداسی کے ماحول میں رہتے تھے۔ میر تقی میر نے کہا تھا کہ:

روتے پھرتے ہیں ساری ساری رات
اب یہی روزگار ہے اپنا (شمس الحق: 61)

ایک دوسری جگہ کہتے ہیں:

رات گزرے ہے مجھے نزع میں روتے روتے
آنکھیں پھر جائیں گی اب صبح کے ہوتے ہوتے (میر، دیوان 1، غزل 0558)

رات کی یہ غم والم کی کیفیت صبح کے ماحول پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ چنانچہ میر تقی میر کی درد پسند طبیعت صبح کو بھی رات ہی کا شاخسانہ تصور کرتی ہے:

خوب ہے اے ابر اک شب آؤ باہم روئیے
پر نہ اتنا بھی کہ ڈوبے شہر کم کم روئیے
وقت خوش دیکھا نہ اک دم سے زیادہ دہر میں
خندۂ صبح چمن پر مثل شبنم روئیے (میر، دیوان 1، غزل 0503)

یا

دم صبح بزم خوش جہاں شب غم سے کم نہ تھی مہرباں
کہ چراغ تھا سو تو دود تھا جو پتنگ تھا سو غبار تھا
دل مضطرب سے گزر گئی شب وصل اپنی ہی فکر میں
نہ دماغ تھا نہ فراغ تھا نہ شکیب تھا نہ قرار تھا (میر، دیوان 1، غزل 0045)

ناصر کاظمی کے یہاں بھی تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ اسی طرح کے جذبات، احساسات، رنج والم کے مضامین ملتے ہیں۔ اگرچہ ناصر بھی راتوں کی تنہائیوں میں آنسو بہاتے ہیں لیکن میر کی طرح بے باک ہو کر نہیں بلکہ بستی والوں کی آنکھ سے پوشیدہ رہ کر۔ کیونکہ شاید انہیں احساس ہے کہ وہ کس بے حسس معاشرے میں حساس ترین لوگوں کے درمیان ہیں۔ مثل میر شب بھر تہنائی میں اداس رہنا اور آنسو بہانا ناصر کا بھی مقدر بنا رہا۔

ترے آنے کا دھوکا سا رہا ہے
دیا سارات بھر جلتا رہا ہے
عجب ہے رات سے آنکھوں کا عالم

یہ دریا رات بھر چڑھتا رہا ہے (دیوان ناصر-58)

ایک دوسری جگہ اسی مضمون کو ناصر نے کچھ یوں زبان دی ہے۔:

خیال آگیا مانوس رہ گزاروں کا
پلٹ کے آگئے منزل سے تیرے دیوانے
کہاں ہے تو کہ ترے انتظار میں اے دوست
تمام رات سلگتے ہیں دل کے ویرانے (دیوان ناصر-98)

ایک وقت ایسا آتا ہے جب شب بھر جاگنے کے بعد بھی نیند آنکھوں سے عنقا ہی رہتی ہے۔جب یہ حساس شاعر، اشرف المخلوقات انسان کو اشرافیہ کے ہاتھوں تذلیل اور بے حرمتی دیکھتا ہے، معاشرے کے دکھوں اور مصائب کو سامنے رکھتا ہے تو باوجود شب بھر کے جگ راتے کہ نیند نہیں آتی۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

دیکھتے دیکھتے تاروں کا سفر ختم ہوا
سو گیا چاند مگر نیند نہ آئی مجھ کو
انہی آنکھوں نے دکھائے کئی بھرپور جمال
انہیں آنکھوں نے شب ہجر دکھائی مجھ کو (ناصر-133)

میر ہو یا ناصر یا کوئی بھی حساس طبعیت کا مالک اور شخص، وہ زندگی بھر ایک لمبی سوچ میں ڈوبا رہتا ہے۔شاید خالق کائنات کے اس شاہکار تخلیق میں قدم جمائے ظلم و ستم اور ناانصافیاں، سماج میں پھیلے برہمن و شودر، امیر و غریب، شاہ اور گدا کا فرق ان حساس طبعیت کے لوگوں کو مزید حساس بنا دیتا ہے۔ شاید اسی واسطے کہا جاتا ہے کہ آرام دہ زندگی بسر کرنے کے لیے زیادہ خوشحال نہیں بلکہ بہت زیادہ بے حس ہونا ضروری ہوتا ہے۔بے حس اور آرام دہ زندگی بھلا کسی شاعر کی قسمت میں کیسے میسر آسکتی ہے؟ کیونکہ شاعر تو ہوتا ہی معاشرہ کا حساس ترین اور اداس ترین فرد ہے۔ چنانچہ یہ باتیں میر و ناصر کاظمی میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ڈاکٹر حسن رضوی، عقیل روبی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"رات ہوتے ہی ناصر کاظمی گم سم ہو جاتے اور ایسے حالات میں تنہائی کے علاوہ انہیں کوئی ہم سفر نہیں بھاتا تھا۔" (رضوی:75)

اگرچہ میر جو کہ خود ناصر کے رہبر تھے اور خود ناصر بھی میر کے بہت بڑے مداح تھے، کے ہاں بھی یہ جذبہ تنہائی پسند ہونے کا موجود ہے۔البتہ میر نے تنہائیوں کے لیے ویرانوں کا انتخاب کیا ہے۔ چنانچہ میر کہتے ہیں:

ان اجڑی ہوئی بستیوں میں دل نہیں لگتا
ہے جی میں وہیں جا بسیں ویرانہ جہاں ہو
وحشت ہے خردمندوں کی صحبت سے مجھے میرؔ
اب جا رہوں گا واں کوئی دیوانہ جہاں ہو (میر، دیوان 5، غزل 1704)

میر کے ہاں تنہائی و اداسی کے لیے اکثر استعمال کردہ استعارات میں ویرانوں اور جنگلوں کی بھرمار ہے۔ ڈاکٹر اے بی اشرف نے بجا تبصرہ کیا ہے۔

"میر مضامینِ غم کے لئے جو پیرایہ اظہار اختیار کرتے ہیں۔ اس میں بھی ایسی تشبیہوں، استعاروں اور علامتوں کی بھرمار ہے جن میں ویرانیوں، اجڑی بستیوں، برباد نگروں، خرابوں، مزاروں گور غریباں، فنا، مرگ، عدم، موت، سراب، غبار، آگ اور خون کے حوالے عام ہیں۔" (اشرف:25)

ظاہری سی بات ہے کہ یہ سب تنہائی اور اداسی کی علامات ہیں۔ ناصر کے ہاں بھی یہ رویہ بہت نمایاں ہے۔ شب بھر جاگتے رہنا، لوگوں سے بھرے ہوئے لاہور میں تنہا پھرنا اس بات کا واضح ثبوت ہے۔

او پچھلی رت کے ساتھی
اب کے برس میں تنہا ہوں
تیری گلی میں سارا دن
دکھ کے کنکر چنتا ہوں (دیوان ناصر-55)

ایک دوسری غزل میں ناصر اپنی تنہائی اور منزل سے کوسوں دور ہونے کو یوں زبان دیتے ہیں:

تنہا تنہا پھرتے ہیں
دل ویراں آنکھیں بے نور
سورج ڈوب چلا ناصرؔ
اور ابھی منزل ہے دور (برگ-بے:77)

تنہائی اور اکیلے پن کا یہ جذبہ راتوں اور سنسانوں میں ناصر کو دامن گیر رہتا تھا۔ بلکہ زیادہ مضبوطی کے ساتھ اس حساس شاعر کا دامن تھام لیتا تھا۔ چنانچہ اس جذبہ کو وہ یوں زبان دیتے ہیں:

جب تک ہم مصروف رہے یہ دنیا تھی سنسان
دن ڈھلتے ہی دھیان میں آئے کیسے کیسے لوگ
ناصرؔ ہم کو رات ملا تھا تنہا اور اداس
وہی پرانی باتیں اس کی وہی پرانا روگ (نشاط خواب۔45)

ایک وقت آتا ہے جب انسان اپنے گردو بیش کے حالات سے سمجھوتا کر لیتا ہے اور یہی دکھ و تکلیف ہی اسے زندہ رہنے کا احساس دلاتے ہیں۔ یہی وقت ہے جن انسان ان جذبات کے زیر اثر ہو کر انہی دل کی جنت خیال کرنے لگتا ہے۔ ناصر کو بھی یہ تنہائی ایک وقت میں دل کی جنت محسوس ہونے لگتی ہے۔ چنانچہ اس کو وہ یوں لباس پہناتے ہیں:

تنہائی کا دکھ گہرا تھا
میں دریا دریا روتا تھا
وہ جنت مرے دل میں چھپی تھی
میں جسے باہر ڈھونڈ رہا تھا
تنہائی مرے دل کی جنت
میں تنہا ہوں میں تنہا تھا (برگ بے-76)

(د) عشق میں ناکامی:

شاید اس دنیا کا ہر شخص کسی نہ کسی حسرت کے ساتھ ہی زندگی بسر کرتا ہے۔ اس مضمون کا موضوع بنے اردو کے یہ دونوں بڑے شعراء کی دیگر حسرتوں کے ساتھ ساتھ ایک اہم حسرت عشق میں ناکامی تھی۔ میر نے لڑکپن میں عشق کیا لیکن جیسا کہ عموماً اس عمر کے معاش سے تنگ اور مفلوک الحال عاشقوں کے عشق کا انجام ناکامی ہوتا ہے میر تقی کے عشق کا بھی یہی انجام ناکامی ہوا۔ البتہ میر عمر بھر اس عشق کو اپنے ساتھ لیے رہے اور جب دلی آئے تو اس محبوبہ کی تصویر انہیں چاند میں بھی نظر آتی تھی۔ عمر بھر میر نے عشق کی اس ناکامی کے غم میں خود کو مبتلا کیے رکھا۔ انہوں نے ایک مثنوی میں عشق کی ناکامی کا ذکر بھی کیا ہے۔ ناصر کو بھی لڑکپن کی عمر میں ایک لڑکی سے عشق ہوا تھا اور نتیجہ وہی نکلا جو میر کے عشق کا نکلا۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا اس عمر کے جیب خالی اور دل جذبات سے بھرے عاشقوں کا نکلتا ہے یعنی ناکامی۔ ناصر نے اپنے اس ناکام عشق کا ذکر اپنی ڈائری میں کیا ہے اور ان کے قریبی دوستوں نے بھی ناصر کاظمی کے اس ناکام عشق کی تصدیق کی ہے (رضوی:92)

میر و ناصر دونوں شاعروں کو عشق اور پھر ناکامی کا تجربہ لڑکپن میں ہوا۔ اگرچہ جس محبوبہ سے انہوں نے محبت کی تھی وہ تو انہیں حاصل نہ ہو سکی البتہ ان شعراء کی شاعری میں ایک تخلیقی تجربہ اور منفرد محرک بن گیا۔ اس ناکام عشق کا ایک فائدہ ان دونوں شعراء کو یہ بھی ہوا کہ ان کی غزلوں میں محبت، الفت، درد، آنسو جیسے جذبات سما گئے۔ میر نے کہا تھا:

اسیر زلف کرے قیدئ کمند کرے
پسند اس کی ہے وہ جس طرح پسند کرے
ہمیشہ چشم ہے نمناک ہاتھ دل پر ہے
خدا کسو کو نہ ہم سا بھی دردمند کرے (میر: دیوان 2، غزل 0970)

ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب اسی عشق کی ناکامی میں اس عظیم شاعر کی پہچان ہی آنسو بہاتی آنکھیں، پیاس سے خشک ہوئے لب اور مسلسل بھاگ دوڑ سے زرد ہوا رنگ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میر اس حالت کو یوں بیان کرتے ہیں:

حاضر یراق بے مزگی کس گھڑی نہیں
معشوق کچھ ہمارا ہے عاشق نبرد سا

کیا میرؔ ہے یہی جو ترے در پہ تھا کھڑا
نمناک چشم وخشک لب ورنگ زرد سا(میر: دیوان 2، غزل0136)

شعراء کی زندگی میں بعض غم ایسے بھی آتے ہیں جن سے دل بجائے برباد اور اجڑنے کے، آباد اور شاد ہو جاتے ہیں۔ غموموں کی اس گھمن پھیریانہ ثباتی میں شاعر بالآخر اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اس شہرِ دل کو اجاڑ ہی دیا جائے۔ لیکن اگر ایسا ہو جائے کہ جس دل کو وہ غم بھی میسر نہ آسکیں جن سے دل آباد ہو سکے تو پھر اس دل کی بے رونقی کا عالم کیا ہو گا۔ میر نے اس حالت کو بہت ہی بہتر انداز میں یوں بیان کیا ہے:

شہر دل ایک مدت اجڑا بسا غموں میں
آخر اجاڑ دینا اس کا قرار پایا

ناصر کے ہاں بھی ہی جذبہ ہمیں بجا طور پر نظر آتا ہے۔ مایوسی اور حسرت کو ناصر نے یوں زبان دی ہے:

ایک تم ہی نہ مل سکے ورنہ
ملنے والے بچھڑ بچھڑ کے ملے(کاظمی:143)

اسی طرزِ حسرت ومایوسی مندرجہ ذیل اشعار میں بھی ملاحظہ ہو:

بھری دنیا میں جی نہیں لگتا
جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی
شہر کی بے چراغ گلیوں میں
زندگی تجھ کو ڈھونڈتی ہے ابھی(کاظمی:132)

کبھی کبھی تو یہ حسرت ومایوسی اس نہج پر پہنچ جاتی ہے کہ شاعر خود بھی اپنے آپ سے اداسی ومایوسی کا سبب پوچھنے لگتا ہے۔:

دل میں اور تو کیا رکھا ہے
تیرا درد چھپا رکھا ہے
چپ چپ کیوں رہتے ہو ناصرؔ
یہ کیا روگ لگا رکھا ہے(کاظمی:88)

ناصر کبھی کبھار اس مایوسی وحسرت سے جی چھاڑنے کے لیے اپنے کسی سنگی، ساتھی کو آواز دیتے ہیں کہ کچھ لمحے ہی سہی لیکن انہیں کچھ تو قرار میسر آئے۔:

کہاں ہے تو کہ ترے انتظار میں اے دوست
تمام رات سلگتے ہیں دل کے ویرانے
امید پرسش غم کس سے کیجیے ناصرؔ

جو اپنے دل پہ گزرتی ہے کوئی کیا جانے (بر بگ بے: 48)

(ھ) رومانویت:

میر تقی میر اور ناصر کاظمی دونوں کی شاعری و زندگی میں ایک مشترک عنصر و محرک رومانویت بھی تھا۔ میر اردو زبان کے ان ابتدائی شعراء میں سے ہیں جن کے ہاں رومانویت، زندگی میں ملے دکھ و کرب کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ میر کے ہاں موجود رومانویت بارے ڈاکٹر محمد خان اشرف کا ذکر کردہ تبصرہ یہاں پر نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اشرف لکھتے ہیں:

"اردو ادب میں اس رومانی دکھ اور کرب کا اولین ادراک و احساس میر تقی میر کے ہاں ملتا ہے۔ میر کے یہاں تخلیقی تجربے کا تخیلانہ اظہار اور اس کے لئے پیکر تراشی کا اسلوب اس کلاسیکیت زدہ دور میں ان کے رومانوی مزاج کی عکاسی کرتا ہے جس کا ایک پہلو میر کی شدید انانیت اور نازک دماغی بھی تھی جسے وہ خود "بے دماغی" سے تعبیر کرتے ہیں۔" (اشرف: 164-165)

ناصر کاظمی کے ہاں بھی ہمیں میر ہی سی رومانویت ملتی ہے۔ حتیٰ کہ ناصر کی تو محض شاعری میں نہیں بلکہ ان کی ذاتی زندگی میں بھی رومانویت کی یہ چاشنی ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ ماضی کی طرف لوٹ جانا، تنہائی میں خوش رہنا، حسن اور عشق کی کیفیات، راتوں کا سفر، پراسرار ماحول کی جستجو۔۔۔ یہ سب انہی رومانوی جذبوں کا ہی تو ثبوت ہے۔ چنانچہ ان جذبوں کو انہوں نے ان اشعار میں خوب زبان دی ہے:

نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں اور بال بناؤں کس کے لیے
وہ شخص تو شہر ہی چھوڑ گیا میں باہر جاؤں کس کے لیے
وہ شہر میں تھا تو اس کے لیے اوروں سے بھی ملنا پڑتا تھا
اب ایسے ویسے لوگوں کے میں ناز اُٹھاؤں کس کے لیے (دیوان ناصر۔ 34)

(و) ہجرت و جلاوطنی کا دکھ:

انسانی زندگی جو کہ دکھ کا ہی ایک دوسرا نام ہے اور جس میں انسان کو کئی طرح کے کرب و مصائب سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان دکھوں میں سے ایک بڑا دکھ ہجرت و جلاوطنی کا دکھ بھی ہوتا ہے۔ قحط سالی، جنگیں، معاش کی تلاش، بہتر معیارِ زندگی کی تلاش جیسے اسباب ہوتے ہیں جو انسان کو اپنا آبائی وطن ترک کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ورنہ تو فرد یا کوئی بھی قوم بغیر کسی بڑی وجہ کے اپنا وطن ترک نہیں کرتی اور نہ ہی بغیر مقصد رہنے کی جگہ سے ہجرت کر کے دوسری جگہ جاتی ہے۔ (علی: 357) اگرچہ ہجرت موجود رشتوں سے دور کرتے ہوئے نئے انسانوں، نئے آسمانوں اور زمینوں سے انسان کا رشتہ جوڑتی ہے۔ جیسا کہ ان دونوں شعراء کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے ذکر کیا گیا ہے کہ ان دونوں شعراء کو عمر ناتواں میں دہلی اور انبالہ سے جدائی، ہجرت اور جلاوطنی، قتل و غارت اور تقسیم کا تلخ تجربہ بھی سہنا پڑا تھا۔ ان دونوں شعراء کی شاعری میں اداسی، ہجرت، جدائی اور وطن کی یادوں کے استعارات کے خوب استعمال کا ایک بنیادی سبب وہ نامساعد حالات تھے جن سے ان شعراء کو گزرنا پڑا تھا۔ میر تقی نے اپنے سامنے دلی کی بربادی، طالع آزمائوں کی جانب سے مقامی باسیوں کا قتل عام، غارت گری اور خون خرابہ دیکھا اور ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ تو دوسری جانب ناصر نے بھی اپنی زندگی میں ملک کی تقسیم، فسادات، قتل و غارت اور خون خرابہ دکھا تھا۔ میر تقی کے ہاں آنکھوں دیکھی اس بربادی کے خوب حوالہ جات ملتے ہیں:

بے یار شہر دل کا ویران ہو رہا ہے
دکھلائی دے جہاں تک میدان ہو رہا ہے
اس منزل جہاں کے باشندے رفتنی ہیں
ہر اک کے ہاں سفر کا سامان ہو رہا ہے (ایضاً)

میر اگرچہ اس کرب سے گزر رہے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ خود کو تسلی دیتے ہیں کہ یہ وقت مشکل اور تکلیف دینے والا تو ضرور ہے مگر جلد یا بہ دیر بالآخر گزر ہی جائے گا۔ چنانچہ کہتے ہیں:

اب خرابہ ہوا جہان آباد
ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا
بے زری کا نہ کر گلا غافل
رہ تسلی کہ یوں مقدر تھا (دیوان ناصر۔36)

ان انسانوں کی اجاڑی ہوئی بستیوں سے انہیں وحشت ہے تو اب رہنے کو میر کسی ویرانہ کی تلاش میں ہیں۔ جہاں قتل وغارت کرنے والے طالع آزمانہ ہوں بلکہ ان کی مثل دیوانہ لوگ رہتے ہوں۔

ان اجڑی ہوئی بستیوں میں دل نہیں لگتا
ہے جی میں وہیں جا بسیں ویرانہ جہاں ہو
وحشت ہے خردمندوں کی صحبت سے مجھے میرؔ
اب جا رہوں گا واں کوئی دیوانہ جہاں ہو (میر، دیوان 5، غزل 1704)

اگر انسان ہجرت، جلاوطنی کا مارا ہوا ہونے کے ساتھ ساتھ قناعت و توکل کی صفت میں بھی کچھ دسترس رکھتا ہو تو زندگی کا ڈھنگ ہی بدل جاتا ہے۔ اسی جذبہ کو میر نے اپنی اس مثنوی میں بیان کیا ہے اور کیا ہی خوب بیان کیا ہے۔:

مجھ کو دماغِ وصف گل و یاسمن نہیں
میں جوں نسیم باد فروش چمن نہیں
کل جا کے ہم نے میرؔ کے در پر سُنا جواب
مُدت ہوئی کہ یاں وہ غریب الوطن نہیں (آزاد: 176)

انبالہ میں پیدا ہونے والے اور وہیں پر اپنی ابتدائی عمر گزارنے والے ناصر کاظمی کو بھی جب ملک کی تقسیم کے نتیجے میں لاہور کو مستقل مسکن بنانا پڑا اور تقسیم ہند کے وقت جو قتل وغارت انہوں نے دیکھی تھی اس نے ان کی روح تک کو شدید زخمی کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

رونقیں تھیں جہاں میں کیا کیا کچھ

لوگ تھے رفتگاں میں کیا کیا کچھ

اب کی فصل بہار سے پہلے

رنگ تھے گلستاں میں کیا کیا کچھ

کیا کہوں اب تمہیں خزاں والو

جل گیا آشیاں میں کیا کیا کچھ (کاظمی:26)

تقسیم ہند اور فسادات کے دنوں میں ناصر نے انسانیت کی جو بربادی، قدروں کی پامالی اور رشتوں کی ذلالت دیکھی تھی اس کو اس حساس شاعر نے شاعری کے آفاقی رنگ میں کچھ یوں بیان کیا ہے:

شہر در شہر گھر جلائے گئے

یوں بھی جشنِ طرب منائے گئے

اک طرف جھوم کر بہار آئی

اک طرف آشیاں جلائے گئے

اک طرف خونِ دل بھی تھا نایاب

اک طرف جشنِ جم منائے گئے

کیا کہوں کس طرح سرِ بازار

عصمتوں کے دیئے بجھائے گئے

آہ وہ خلوتوں کے سرمائے

مجمعِ عام میں لُٹائے گئے (ناصر۔38)

ناصر کاظمی کی زندگی کا تلخ ترین تجربہ "بٹوارہ" تھا۔ ناصر نے اپنی شاعری میں نہ صرف ذاتی ہجرت کی شکست وریخت کا ذکر کیا ہے بلکہ اجتماعی تجربہ گاہ کا فرض بھی سرانجام دیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

زمیں لوگوں سے خالی ہو رہی ہے

یہ رنگِ آسماں دیکھا نہ جائے

کہیں آگ اور کہیں لاشوں کے انبار

بس اے دورِ زماں دیکھا نہ جائے (دیوان ناصر:50)

دونوں شعراء کو لوگوں سے بھرا ہوئی تاریخی شہر دلی یاد آتا ہے پھر دلی کی بربادی، دلی میں برپا ہوا قتل وغارت کا بازار اور لٹی ہوئی دلی بھی ان شعراء کی تلخ یادوں کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔ چنانچہ ناصر کہتے ہیں:

گلی گلی آباد تھی جن سے کہاں گئے وہ لوگ
دلی اب کے ایسی اجڑی گھر گھر پھیلا سوگ
سارا سارا دن گلیوں میں پھرتے ہیں بے کار
راتوں اٹھ اٹھ کر روتے ہیں اس نگری کے لوگ
سہمے سہمے سے بیٹھے ہیں راگی اور فن کار
بھور بھئے اب ان گلیوں میں کون سنائے جوگ (ایضا)

ناصر و میر کے درمیان مماثلات کی طرح متفرقات کو بھی تلاش کیا جاسکتا ہے۔ اس مختصر مضمون میں ہم دونوں شعراء کی شاعری کا ایک طائرانہ تجزیہ کرتے ہوئے محض مماثلات کو ہی زیر بحث لائے ہیں۔ اپنے اس مضمون کا اختتام سجاد باقر رضوی کے مندرجہ ذیل اقتباس سے کرتے ہیں:

"مزاج کے اعتبار سے ناصر، میر، کے قریب تھے۔ البتہ انہیں میر کی طرح زندگی کرنے کا ڈھب نہیں ملا تھا۔ میر کی طبیعت کا سوز و گداز پھیلی ہوئی کائنات میں اپنی ذات کو سمیٹنے کا سلیقہ، احساس نامرادی کے ساتھ قناعت، ایک خاص وضع کی زندگی، یہ سب کچھ انہیں اپنے عہد کے فلسفہ زیست سے ملا تھا۔ اس کے برعکس ناصر کاظمی رومانی مزاج کے حامل تھے۔ ان کا احساسِ نامرادی، طبیعت کا گداز، آئیڈیل اور حقیقت کے تضاد سے پیدا ہوا تھا۔ وہ پھیلنے کی خواہش کے باوجود سمیٹنے پر مجبور تھے۔ اس کا نتیجہ ان کی اداسی، تلونِ طبع اور شدید احساسِ تنہائی تھا۔ شخصیت کو منظم کرنے والا اصول ان کے پاس نہ تھا۔ انہیں نہ کوئی فلسفہ زیست ملا تھا اور نہ ہی کسی نظریہ سے ان کی وابستگی تھی۔۔۔ تاہم اگر میر سے انہوں نے اسلوبِ حیات نہ پایا تو اسلوبِ فن ضرور حاصل کیا۔ (رضوی: 163-164)

اختتام:

میر تقی میر اور ناصر کاظمی کی شاعری اردو زبان وادب میں ایک خاص اور اہم مقام رکھتی ہے جو اردو ادب کی تاریخ میں دو معینہ ادوار کو جوانمردانہ عظمت دیتی ہے۔ ان دونوں شعراء کی شاعری کا تقابلی مطالعہ انسانیت کی حقیقتوں اور مختلف پہلوؤں کی روشنی میں ایک نئی روش کے اضافہ کا سبب بن سکتی ہے۔ میر تقی میر کی شاعری میں زندگی کے تر وتازہ معائنے، انسانیت کے مسائل، ہجرت کا دکھ اور انسانی روابط کی اہمیت کا وسیع منظر نامہ پایا جاتا ہے جبکہ ناصر کاظمی کی شاعری میں غم، تنہائی، اور انسانیت کے احساسات بھرپور طور پر موجود ہیں۔ ان کے شاعرانہ افکار اور احساسات نے اُن کے مواقع اور دور کی معاشرتی، سیاسی، اور سماجی حقیقتوں کو بہتر طور پر سمجھا ہے۔ ان کی شاعری میں انسانیت، حس وحال، اور احساسِ غمزدگی کی موجودگی اُن کی ادبی فہرست کو معیاری بناتی ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس تقابلی مطالعہ کے انداز سے میر تقی میر اور ناصر کاظمی کی شاعری اردو ادب میں ایک نئے روشن پہلو کا اضافہ کر سکتی ہے۔

مصادر و مراجع

اختر، سلیم، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور 2000۔

Iktar, Salim, Urdu Adab ki Mukhtasir Tareekh, Sang-e-Meel Publications, Lahore 2000.

اشرف، اے بی، میر، غالب اور اقبال، بیکن بکس، ملتان 1999ء۔

Ashraf, A.B., Meer, Ghalib aur Iqbal, Beacon Books, Multan 1999.

آزاد، محمد حسین، آبِ حیات، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور 1995ء۔

Azad, Muhammad Husain, Aab-e-Hayat, Sang-e-Meel Publications, Lahore 1995.

بدایونی، عبدالقادر، منتخب التواریخ، (اردو ترجمہ محمود فاروقی)، شیخ غلام اینڈ سنز، لاہور، ت-ن۔

Badayuni, Abdul Qadir, Muntakhab al-Tawarikh, (Urdu Tarjuma by Mahmood Farooqi), Sheikh Ghulam Ali and Sons, Lahore, n.d.

رضوی، حسن، وہ تیرا شاعر وہ تیرا ناصر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور 1996۔

Rizvi, Hasan, Woh Tera Shaair Woh Tera Naseer, Sang-e-Meel Publications, Lahore 1996.

رضوی، سجاد باقر، معروضات، پولیمر پبلی کیشنز، لاہور 1990۔

Rizvi, Sajjad Baqir, Ma'arufaat, Polymer Publications, Lahore 1990.

رومانیت اور اردو ادب میں رومانی تحریک، الوقار پبلیکیشنز، لاہور 1998

Romaniyat aur Urdu Adab Mein Romani Tehreek, Al-Waqar Publications, Lahore 1998.

سید عبداللہ، میر تقی میر، معارف، ج 21، دانش گاہ پنجاب، لاہور 1987، ص 927-931۔

Syed Abdullah, Mir Taqi Mir, Ma'arif, Vol. 21, Dānishgāh-e-Punjab, Lahore 1987, pp. 927-931.

شمس الحق، محمد، پیمانہ غزل، نیشنل بک فاونڈیشن، اسلام آباد 2009۔

Shams ul Haq, Muhammad, Paimana-e-Ghazal, National Book Foundation, Islamabad 2009.

علی، حافظ عامر، سلاطینِ سلاجقہ روم کے غیر مسلم رعایا بارے مذہبی رجحانات، انکشاف، 9/3، (2023)، ص 381-357۔

Ali, Hafiz Amer, Sultaane-e-Salajqa-e-Rum ke Ghair Muslim Rayaa Baray Mazhabi Rajhanaat, Inkishaaf, 3/9, (2023), pp. 381, 357.

کاظمی، ناصر، برگِ نے، آزاد بک ڈپو، امرتسر 1998ء۔

Kazmi, Naseer, Barg-e-Ne, Azad Book Depot, Amritsar 1998.

کلیاتِ اقبال، مطبوعہ اقبال اکادمی، لاہور 1990ء۔

"Kulliyat-e-Iqbal, Matbu'at-e-Iqbal Academy, Lahore 1990.

میر تقی میر، میریات، دیوان از ریختہ۔

Mir Taqi Mir, Miriyat, Diwan Az Rekhta.